(غلام گردش)

شخصیات اور ریاست، طاقتور کون؟

کیا ذہنی تعصّبات کو دور رکھ کر سوچنا ممکن ہے؟ کیا واقعی اپنی سیاسی فکر سے پرے ہونا ممکن ہے۔ کیا اہلیت ہے کہ ہم سماجی، مذہبی اور ذاتی مفادات سے اوپر اُٹھ کر سوچ سکیں؟ ہمارے جیسے ملک میں غیر متعصب سوچ، فکر، عمل اور ردِ عمل ممکن نہیں ہے۔ بلکہ اکثریت ملکوں میں بھی مکمل طور پر غیر جانبدارانہ رویہ نظر نہیں آتا۔ لیکن ہمارے مسائل حد درجہ اُلجھ چکے ہیں۔ ایک ذہنی گنجل ہے جسکا دھاگہ کوئی بھی تلاش نہیں کرسکتا۔ سات دہائیاں نہیں، برصغیر میں دولت کی فراوانی ہونے کے باوجود ایک ذہنی افلاس ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد، اس مفلسی میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں آئی۔ لگتا ہے کہ معاملات مزید پیچیدہ ہو چکے ہیں۔ ہمارا ملک 1947 سے نازک حالات سے گزر رہا ہے۔ بدقسمتی سے تنزلی کا یہ سفر آج بھی اسی زور و شور سے جاری ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے۔ جنوبی کوریا سے لیکر چین تک قومیں برباد ہونے کے بعد کھڑی ہوگئیں۔ افریقہ تک کے ممالک جان گئے کہ ترقی کا سفر کیسے شروع ہوتا ہے۔ وہ کون سا لائحہ عمل ہے جس سے ملک مفلسی سے نکل کر آگے کی طرف جاسکتا ہے۔ مگر تکلیف دہ نکتہ یہ ہے کہ بطور قوم اور ملک، ہم دائروں کے سفر در سفر میں ہی مصروف ہیں۔ وہی جذباتیت، سطحیت اور وہی کم علمی والی راہ، جس پر ہر سفر رائیگاں ہے۔ کسی بھی ملک یا قوم بہتری کی طرف اس وقت جاتی ہے جب اسکی قیادت میں یہ شعور آجاتا ہے کہ نہیں، اب ملک کو آگے جانا چاہیے۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ پوری دنیا میں بہترین قیادت کا عملی اُصول بھی ہمارے ہاں دم توڑ چکا ہے۔ بائیس کروڑ لوگوں میں اکثریت کو اجتماعی شعور ہی نہیں ہے کہ ترقی کس چڑیا کا نام ہے۔ تنزلی کے سفر سے کیسے نجات حاصل کی جائے۔ ہاں، ہمارا ہر شہری ذاتی حالات کو ایک پَل میں بہترین کرنے کے خواب ضرور دیکھتا رہتا ہے۔ یہ خواب کچھ لوگوں کی حد تک تعبیر میں بدل جاتے ہیں۔ انہیں کسی نہ کسی طور پر اہم رول مل جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو بگاڑ بھی ایسے ہی جنم لیتا ہے۔ جب ذاتی مفاد، قومی سوچ سے آگے نکل جائے تو حالات بالکل ہمارے جیسے ہو جاتے ہیں۔ کئی دانشور فرماتے ہیں کہ لوگوں کو تربیت کی ضرورت ہے۔ بالکل درست بات، مگر کون کریگا، یہ تربیت۔ اس سے بھی اہم سوال کہ کیوں کریگا۔ اسی طرح سیاسی، سماجی، اور اقتصادی شعور بڑھانے پر کون محنت کریگا۔ اس طرح کا کوئی نیک جذبہ اجتماعی طور پر ہمارے اندر موجود نہیں ہے۔ تھک ہار کر کہا جاتا ہے کہ اداروں کو مضبوط کیجئے۔ چلیے، یہ بھی درست بات ہے۔ مگر کون قومی اداروں کو بہتر کریگا۔ ہمارے تمام قومی ادارے بھی دراصل شخصیت پرستی کے اردگرد ہی کام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان اداروں کو اگر اسکے سربراہان ہی ٹھیک کرنے میں بہت سنجیدہ نہیں ہیں تو پھر معاملہ کیونکر درست ہوگا۔

گزشتہ چار دہائیاں تو عجیب سی ہیں۔ جمہوریت کا شور اور کرپشن سے بھرپور چالیس سال ہمیں تقریباً ختم کر چکے ہیں۔ بہت زیادہ ماضی کے متعلق بات کرنا مناسب نہیں۔ مگر آنکھوں کے سامنے لوگوں نے جمہوریت پسندی کی آڑ میں اس درجہ لوٹ مار کی ہے کہ کامیاب ہونے کی سماجی تعریف ہی تبدیل ہو چکی ہے۔ یاد رکھیے کہ طاقتور لوگ یعنی حکمران ہی عام لوگوں کے رول ماڈل ہوتے ہیں۔ سماج میں تقریباً ہر فرد، بالکل اسی طرح کا ہو جاتا ہے جس طرح کے حاکم ہوتے ہیں۔ حکمران کی سوچ نیچے کی طرف جاتی ہے۔ ہاں، ایک بات

اور، یہاں اگر فوج نے بھی اقتدار پر قبضہ کیا ہے تو پہلے چند ماہ چھوڑ کر معاملات بالکل پہلے جیسے اَبتر چلنا شروع ہو جاتے ہیں۔عملیت پسندی بہت جلد غالب آ جاتی ہے۔اب فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ ہم نے کیونکر غلطیاں کیں اور انکو کیسے دور کرینگے۔یہی وہ روش ہے جو تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوسکتی ہے۔طاقتور اداروں نے کبھی بھٹو کو جنم دیا ہے تو کبھی نواز شریف کو۔کنونشن مسلم لیگ کی تشکیل سے شروع ہونے والا سفر کیا رُک چکا ہے۔اس پر آج بھی دو آراء موجود ہیں۔مگر بگاڑ کو عروج دینے میں وسطی پنجاب کے اس سیاسی گروہ کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے جو رپبلیکن پارٹی سے لیکر آج تک کسی بھی اصول سے وابسطہ نہیں ہے۔شائد غلط لکھ گیا۔ایک اُصول ہے۔نظر نہ آنے والا۔کہیں بھی درج شدہ نہیں ہے۔وہ ہے کہ اپنے آپکو مالی طور پر مضبوط بناؤ، سیاسی طاقت خود بخود آ جائیگی۔اس سوچ میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔بلکہ گزشتہ دس پندرہ برس میں یہ فکر حد درجہ طاقتور ہو چکی ہے۔وسطی پنجاب کا ذکر اسلیے کیا کہ ہمارے ملک میں اختیارات کا محور یہی قرار پا چکا ہے۔دولت اور اقتدار کے مشکل کھیل میں جیسے یہاں کے اہم افراد نے کمال مہارت حاصل کی ہے وہ بذاتِ خود ایک حیرت انگیز عمل ہے۔تقسیمِ ہند کے بعد، یعنی پاکستان کے وجود میں آنے سے لیکر اب تک پنجاب ایک اہم ترین فیکٹر بن چکا ہے جو سیاسی سوچ پر قوت سے اثر انداز ہونے کی طاقت رکھتا ہے۔گزشتہ تین دہائیوں میں سب سے زیادہ فکری تنزلی بھی یہیں دیکھنے میں ملتی ہے۔لوگ سمجھتے ہیں کہ سیاستدان مکمل طور پر ناکام ہوئے ہیں۔یہ قدرے درست بات ہے۔مگر سوچنے کی بات ہے کہ کیا ہمارے اہل علم، دانشور، اہل فکر مکمل طور پر بگاڑ کا حصہ نہیں ہیں۔کیا ہمارے مذہبی حلقے پوری سوسائٹی میں انتشار کے علمبردار نہیں ہیں۔دوبارہ عرض کرونگا کہ اب مجھے ایک معمولی سی تبدیلی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔لوگوں کو اندازہ ہو رہا ہے کہ انکے مقدر، مستقبل اور حال سے بھرپور کھلواڑ کیا گیا ہے۔لیکن وثوق سے نہیں کہہ سکتا، کہ یہ اندازہ کس درجہ پختہ ہے اور کس طرح عمل میں تبدیل ہوگا۔یہ اگر عمل میں تبدیل نہ ہو پایا تو اس سے آگے کسی قسم کی اور منزل نہیں ہے۔پھر لیبیا، عراق اور افغانستان جیسے ناکام ممالک میں ایک اور ملک کا اضافہ ہو جائیگا۔

اَل شریف کو جمہوریت کے نام پر پنجاب اور پاکستان میں حکومت کرنے کے کم از کم بیس پچیس برس دیے گئے۔ریاستی اداروں نے تمام دیگر فریقین کے ساتھ زیادتی کرتے ہوئے اس خاندان پر اقتدار کی چھتر چھایا قائم کی۔مگر ہماری مکمل بدقسمتی ہے کہ اس بھرپور وقت کو ان لوگوں نے صرف اپنی مالیاتی ترقی کیلئے استعمال کیا۔یہ سمجھ چکے تھے کہ اگر انکے پاس دولت ہوگی تو پنجاب کے تمام طاقتور فریق انکے ساتھ شامل ہو جائینگے۔تاریخ کو پڑھے بغیر اَل شریف نے برصغیر کی نفسیات کا سب سے بڑا قانون اَز بر کر لیا۔اقتدار ہمیشہ دولت کے پہاڑ پر خود چل کر آتا ہے۔دشمن تک پیسہ کمانے کیلئے ساتھ مل جاتے ہیں۔غرض مندوں کی قطاریں قائم ہو جاتی ہیں۔چنانچہ اس کھیل میں اقتدار کی بساط پر ایک ایسے فریق کو بٹھا دیا، جو پنجاب کے طاقتور ترین گروہوں اور شخصیات کی نمائندگی کرتا تھا۔اس خاندان نے اسی اُصول کے تحت بین الاقوامی اثر ورسوخ اس حد تک قائم کر لیا کہ کئی ملکوں کے حکمران انکے کاروباری شراکت دار بن گئے۔نتیجہ یہ کہ یہ لوگ سیاست میں ریاست سے زیادہ مضبوط ہو گئے۔انکے ساتھ ہر وہ فریق شامل ہو گیا جو دانستہ یا غیر دانستہ اس کھیل کو سمجھتا تھا۔جیسے جیسے وقت گزرے گا، مالی بے ضابطگیوں کی وہ وہ داستانیں سامنے آئینگی کہ لوگ دانتوں میں انگلیاں چبا لینگے۔کرپشن کرنے والے کو اپنے جرائم کا سب سے زیادہ پتہ ہوتا ہے۔وہ سایہ سے بھی خوف زدہ رہتا ہے۔اس طرح کے افراد کے دو طرح کے مخصوص ردِعمل ہوتے ہیں۔ایک

تو کسی قسم کی بے ضابطگی سے مکمل انکار اور دوسرا، اپنے تمام جرائم کیلئے ایک سموک سکرین قائم کرنا۔ جسکے پار دیکھنے کو ملک دشمنی کا نام تک بھی دیا جاسکتا ہے۔ برادر خورد پہلی حکمتِ عملی استعمال کر رہے ہیں۔ وہ تفتیشی اداروں کو ڈرانے دھمکانے کا کام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خود ہی، اپنے متعلق اسمبلی میں گھنٹوں تقریر کرتے ہیں۔ اپنی صفائی خود دیتے ہیں۔ لیکن ایک جگہ جا کر ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں کہ انکے پاس پیسہ کہاں سے آیا۔ انکے حواری بھی جمہوریت کی آڑ میں چھپنے کی مکمل کوشش کر رہے ہیں۔ دوسرا ردِ عمل بھی بہت اہم ہے۔ ہیبت ناک قرضے لیکر بڑے بڑے منصوبے بنانا، انہیں ترقی کا نام دینا اور پھر ان سے پیسے کمانا۔ تیسری دنیا میں اکثریت حکمران ترقی کے بڑے منصوبون کا اعلان کرتے ہیں۔ کچھ مکمل ہو جاتے ہیں اور اکثر ویسے ہی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ پاتے۔ ترقی پذیر ملکوں کے سیاسی اور فوجی حکمرانوں پر غور کیجئے۔ اندازہ ہو جائیگا کہ ملکی خزانہ لوٹنے کا طریقہ کار حیرت انگیز حد تک یکساں ہے۔ منصوبوں کی آڑ میں لوگوں کو بیوقوف بنانا، ان منصوبوں کو اپنی ذاتی ترقی اور پروپیگنڈے کیلئے استعمال کرنا۔ بڑے میاں صاحب نے اپنی حکمتِ عملی اسی تناظر میں ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر غلطی کہاں ہوئی۔ معاملہ کہاں خراب ہوا۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب طاقتور ترین اداروں کے وجود پر سوال اُٹھائے گئے۔ یہ آخری خندق، ایک سیاسی قبر بن گئی۔ نتائج سامنے ہیں۔ برصغیر کی تاریخ میں ہمیشہ طاقتور فریق ہی کامیاب ہوتا ہے۔ طالبعلم کیلئے آج سب کچھ جو ہو رہا ہے قطعاً حیرت انگیز نہیں ہے۔ ہمارے خطے میں ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے اور مستقبل میں بھی یہی ہوتا رہیگا۔

اب آہستہ آہستہ سب کچھ بدل رہا ہے۔ ایک ایسی حکومت سامنے آئی ہے جسکا لیڈر حد درجہ ایماندار ہے۔ موجودہ وزیراعظم کے پاس کُل اثاثہ انکی وہ شہرت ہے جس پر دشمن بھی انگلی نہیں اُٹھا سکتا۔ سیاست میں انکا طرزِ عمل آہستہ آہستہ مزید دانا ہوگا۔ خارجی محاذ پر تو یہ شخص وہ کچھ کر گیا ہے جو ان سے پہلے کوئی نہیں کر پایا۔ داخلی حالات، تقریباً ایک سے دو سال میں جوہری طور پر تبدیل ہو جائینگے۔ کئی غلطیوں اور خامیوں کے باوجود، موجودہ وزیراعظم اور انکی ٹیم بھرپور محنت کر رہی ہے۔ صرف سو دنوں میں کسی بھی طرح کے نتائج اَخذ کرنا قبل اَز وقت ہے۔ ہاں، ایک بات ضرور ثابت ہوئی ہے کہ جب بھی کوئی شخص ریاست سے زیادہ مضبوط ہونے کی کوشش کرتا ہے، تو کچھ عرصے کے بعد وہ خود اپنے بوجھ تلے ختم ہو جاتا ہے۔ لہذا کسی کو بھی ریاست سے زیادہ طاقتور ہونے کی اجازت نہیں دی جائیگی۔ پرانے تجربے کا سبق بہرحال یہی ہے!

راؤ منظر حیات